فکر و نظر............ اسلام آباد                    جلد: ۴۶    شمارہ: ۲،۱

# مدینے والا☆

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی

وہ ۱۴۲۰ھ کا ماہِ رمضان تھا۔ اس سال بھی ہمیں ربِ ذوالجلال نے توفیق عطا فرمائی تھی کہ رحمتوں، برکتوں اور مغفرتوں کا یہ مہینہ ہم مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں گزاریں۔ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا۔ ہم مدینہ منورہ میں عزیزم مسعود چودھری کے گھر میں مقیم تھے۔ میرا بلڈ پریشر اس سال قابو میں نہیں آرہا تھا۔ شاہدہ (بیگم مسعود) پابندی سے میرا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھیں۔ نیچے کا پریشر ۱۲۰ سے کم ہونے میں نہیں آرہا تھا اور اوپر کا پریشر ۱۸۰ سے ۲۱۰ کے درمیان رہتا۔ بلقیس مسجد نبویؐ میں معتکف تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ وہیں رہتیں اور میری حاضری فجر، ظہر اور عشاء تک کی نمازوں تک محدود تھی۔ بلقیس سے نمازِ عشاء اور تراویح کے بعد ملاقات ہوتی کیونکہ مسعود ان کا کھانا لے کر مسجد نبوی جاتے، مگر یہ ''ملاقات'' محض ہم طعامی تک محدود تھی۔ وہ آکر سلام کرتیں، کھانا کھاتیں اور خدا حافظ کہہ کر مسجد لوٹ جاتیں کہ اعتکاف غیر ضروری باتوں کی اجازت نہیں دیتا۔ میرا بیشتر وقت تلاوتِ قرآن حکیم کے علاوہ بخاری شریف اور سیرت کی کتابوں کے مطالعے میں گزرتا یا بستر پر لیٹے ہوئے سوچتا رہتا۔ وہ ۱۹۹۹ء کے دسمبر کا مہینہ تھا۔ ایک شمسی سال ختم ہونے جارہا تھا بلکہ یہ ایک صدی کے اختتام کا نقطۂ آغاز اور ایک نئی ہزاری (ملی نیم ) کا دیباچہ تھا۔ سوچتا رہتا تھا کہ اسلامیوں کا نیا عہدِ عروج کب شروع ہوگا یا ہم محض خواب دیکھتے رہیں گے۔ ہمارے عروج کا رشتہ اقرار سے ہے جو اسلام کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور آج ہم جہل میں مبتلا ہیں۔ ''صفہ'' کی وارث امت پر آج علوم کے دروازے بند ہیں۔ ساری دنیائے اسلام میں آج ایک بھی مثالی یونیورسٹی نہیں ہے۔ بیماری اور مسائل پر غور کرنے کے لئے اسی زمانے میں فضل الرحمٰن سلمہ، (ابن عبد العزیز شرقی) کے ہاں علی میاں کی کتاب ''نقوش مدینہ'' نظر آئی۔ وہ ایسی کتابوں میں سے ہے جو اپنے قاری سے بات کرتی ہیں۔ کئی بار کی پڑھی ہوئی کتاب میں فضل الرحمٰن صاحب سے مستعار لے آیا۔ مدینہ منورہ میں ''نقوش مدینہ'' کا مطالعہ میرے لئے ایک نیا تجربہ بن گیا، بالخصوص وجودِ امت سے متعلق مضمون۔ مسجد نبوی الشریف میں دوسری تیسری صف میں بیٹھ کر یا مواجہ شریف کے قریب بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر صلوۃ و سلام پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ وہ اکابر و رجالِ عظیم میری ادھ کھلی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔

---

☆ ''سائبان لوگ'' ستمبر ۲۰۰۷ء

رمضان المبارک کے آخری عشرے کی ابتدائی راتوں میں خلوت کی ایسی گھڑیاں میسر آجاتی ہیں۔ علی میاں کے اس مضمون نے میرے اس خیال کو میرے لئے حقیقت بنا دیا کہ اس امت کے مصنفوں کا حسنِ خیال اور جمالِ تحریر، سپاہیوں اور سپہ سالاروں کی تلواروں کا کاٹ، حکمرانوں کا اندازِ جہاں بینی (صرف جہاں گیری نہیں) علماء کے علم میں آہِ سحر گاہی اور گریۂ نیم شبی کے عناصر، ماؤں کی شفقت میں انسان سازی کی شان، ان سب میں اسی رسول کریم ﷺ کی تعلیم اور انفاسِ جاں بخشی شامل ہیں۔

یہ اہلِ سیف و قلم، صاحبانِ جود و عطا
نقوشِ پا لئے ہوئے کتنے کارواں پیدا

وقار صدیقی اجمیری نے سچ کہا تھا۔

تاریخ محمدؐ کا نشانِ کفِ پا لئے
یہ بات غلط ہے کہ قلم کچھ نہیں لکھتے

اور جب میں اس ''تجربے'' سے گزر کر صحت یاب ہو رہا تھا تو رمضان المبارک کی ۲۳ویں تاریخ کو یہ خبر ہم تک پہنچی کہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر اچانک نہ ہونے کے باوجود اچانک تھی۔ لبوں پر ان کے لئے دعائیں تھیں اور دل کی دھڑکنیں ان دعاؤں پر آمین کہہ رہی تھیں۔ ہندوستان، پاکستان، عرب دنیا، یورپ اور امریکا میں علی میاں کے ارادت مند، معتقد، ان سے اور ان کی تحریروں سے فیض پانے والے ہر گھڑی ان کی خیرت سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض ارادت کیش تو ان کی مزاج پرسی کے لئے مختلف ملکوں سے تکیہ رائے بریلی پہنچ گئے تھے۔ ۲۳ رمضان کو دسمبر کی آخری تاریخ تھی۔ ۳۱ دسمبر۔ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کی زندگی کی طرح ان کی موت اور اس کی تاریخ کو بھی غور و فکر کا اشاریہ اور وسیلہ بنا دیتا ہے۔ یہ سال کا اختتام ہی نہیں تھا، ایک عہد کا اختتام تھا۔ ایک داعی الی اللہ دنیا سے رخصت ہوا اور وقت کی بساط کو اپنے ساتھ لپیٹ لے گیا۔ وقت کا سفر جاری ہے۔ یہ بساط کون جانے کب لپیٹی جائے گی۔ ابھی جو میں نے بساط کو لپیٹنے کی بات کی وہ علی میاں کی موت پر میرے تأثر کا اظہار ہے۔ عالم کی موت عالَم کی موت تھی۔ دنیائے اسلام رنج و غم میں ڈوب گئی۔ اور جب میں نے مسجد نبویؐ میں لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ علی میاں کی نمازِ جنازہ ادا کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کی دینی خدمات کا اجرا نہیں عطا کیا اور کس انداز سے ہمارے لئے تسلی فراہم کی۔

علی میاں کو میں اپنے لڑکپن سے دیکھ رہا تھا۔ عمو جان کے ساتھ جب لکھنؤ جاتا تو ندوۃ العلماء یا علی میاں کے مکان میں ڈاکٹر عبد العلی صاحب کے مطب اور مکان پر اکثر و بیشتر علی میاں سے ملاقات ہو جاتی۔ لکھنؤ اور کانپور کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔ علی میاں کا کانپور آنا جانا لگا رہتا۔ ان کے کئی عزیز کانپور میں مقیم تھے۔ ان کے رشتے کے ماموں ڈاکٹر سید ابو محمد کانپور میں مطب کرتے تھے۔ ان کے ماموں زاد بھائی سید ابوبکر حسنی حلیم مسلم کالج میں عربی کے استاد تھے۔ ۱۹۴۶ء میں باجی (والدہ مرحومہ) کے انتقال کے بعد عموجان کا نکاح ابوبکر حسنی صاحب کی بہن سے ہو گیا۔ یہ ضروری تھا کیونکہ میرے بھائی بہن چھوٹے تھے۔ میں بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا اور اس وقت انٹر کے پہلے سال کا طالب علم تھا۔ کسی خاتون کے بغیر گھر کا چلنا اور بچوں کی نگہداشت اور تربیت ممکن نہ تھی۔ آج میں گواہی دیتا ہوں کہ باجی امی نے یہ فریضہ بڑی خوبی سے انجام دیا۔ اس درجے خلوص اور محبت کے ساتھ جب کوئی ابو البرکات اور طاہرہ سے ''سوتیلی ماں'' کا ذکر کرتا تو وہ دونوں روتے ہوئے گھر آتے اور باجی امی سے روتے ہوئے کہتے کہ ''لوگ آپ کو سوتیلی ماں کیوں کہتے ہیں؟ سوتیلی کیا ہوتی ہے۔ آپ تو ہماری ماں ہیں۔ ہیں نا''

اس رشتے نے میرے محبوب استاد کو میرا ماموں بنا دیا اور یہی رشتہ علی میاں سے بھی قائم ہو گیا۔ چھوٹے بھائی بہن تکیہ بریلی اور لکھنؤ جا کر علی میاں کے گھر میں کئی کئی دن رہتے۔ تعلیمی مصروفیت اور سال ڈیڑھ سال کے بعد پاکستان آجانے کی وجہ سے میں اپنی دوسری نانہال کی محبت سے اپنا حصہ پوری طرح نہ پا سکا لیکن ابوبکر حسنی صاحب اکثر ہمارے ہاں آنے لگے، اور اسی طرح جب علی میاں کانپور آتے تو ہمارے ہاں آنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ کانپور میں مختلف تقریبات ان کی منتظر ہوتیں۔ ندوۃ العلماء کے معاون اہلِ خیر اپنے مکانوں میں اجتماع اور دعوتوں کا اہتمام کرتے اور علی میاں کی تشریف آوری کو اپنے گھر کے لئے باعثِ برکت سمجھتے، لیکن علی میاں کے مزاج، نظام اخلاق میں صلہ رحمی اور اعزاء کی دل دہی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے ان کے گھر جاتے اور انہیں کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ ضرور کرتے۔ علی میاں کی یہ ادا آخر تک قائم رہی، حضرت سید احمد شہید کے گھرانے کے افراد رائے بریلی، ٹونک، فتح پور، ہسوہ اور دوسرے مقامات پر مقیم تھے، پھر اس خاندان کے بہت سے لوگ کراچی منتقل ہو گئے۔ علی میاں جب بھی ان شہروں میں جاتے اپنے عزیزوں سے ضرور ملتے، اور اس بارے میں وہ بہت باخبر تھے۔ کراچی دو تین دن کے لئے آئے اور پھر دلی کالونی ڈاکٹر یونس حسنی کے ہاں ان کی بچی نجمہ کی تعزیت کے لئے پہنچ گئے۔

کراچی میں سرکاری مہمان خانوں اور شاندار ہوٹلوں کو چھوڑ کر اپنے رشتے کے داماد قاری رشید الحسن کے ہاں بنوری ٹاؤن کے ایک مکان میں ٹھہرتے اور اسی مکان میں عمائدینِ سلطنت سے لے کر ان کے عام عقیدت مند تک ان سے ملاقات کرتے۔ اسی مکان میں مجھے ان سے بیعت ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے ہم درس مولانا عبد الرشید نعمانی میرے ساتھ تھے۔ جو حضرت رائے پوریؒ کے مرید تھے۔ مگر جس مجلس میں میں علی میاں کا مرید ہوا، اسی میں مولانا نعمانی نے بھی ان سے تجدید بیعت کی۔ میں اس لمحے اس حیا اور تواضع کا اظہار نہیں کرسکتا، جو علی میاں کے چہرے پر تھی۔ انہوں نے نعمانی صاحب کو بہت منع کیا کہ آخر کیوں؟ لیکن نعمانی صاحب کے اصرار سے مجبور ہو کر انہوں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔ اسی سے مجھے اپنے والد کے بیعت ہونے کا موقع یاد آ گیا۔ عموجان اپنے والد حضرت سید شاہ محمد اکبر سے بیعت تھے۔ ان کی وفات کے کوئی بیس سال بعد جب ایک شام علی میاں ہمارے ہاں آئے تو عموجان نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا کہ علی ہمیں بیعت کر لو۔ علی میاں کا سر جھک گیا۔ اور انہوں نے آہستہ سے کہا کہ ثاقب بھائی آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ عموجان نے ان سے جواباً کہا کہ یہ ہمارا حکم ہے۔ اور علی میاں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ میرے ماموں سید ابوبکر حسنی علی میاں سے عمر میں ایک دو سال بڑے تھے۔ لیکن یہ خاندان اس بات کو اپنا دستور حیات جانتا تھا کہ ؎

گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

ابوبکر علی میاں کے مریدوں کے سامنے ان پر سخت تنقید کر دیتے، اور علی میاں مسکراتے رہتے، کبھی جواب نہ دیتے۔ ایک ترقی پسند ادیب نہ جانے کن مصلحتوں کے پیش نظر علی میاں کے مرید ہو گئے۔ حالانکہ تصوف تو درکنار اسلام سے بھی ان کو کوئی سنجیدہ واسطہ نہ تھا۔ ایک دن یہ ترقی پسند مرید گفتگو میں ایسے محاورے استعمال کرتے رہے جن میں مذہب کی تخفیف کے پہلو ہیں۔ ابوبکر صاحب سے برداشت نہ ہوا۔ اور انہوں نے ان سے الجھنے کی بجائے علی میاں سے کہا کہ علی یہ ہیں تمہارے مرید؟ تزکیۂ نفس تو بعد کی بات ہے ان کو تو گفتگو کے آداب بھی نہیں آتے، تم مذہب استخلاف کیسے برداشت کرتے ہو؟ محفل خاصی بدمزہ ہوگئی اور جب وہ صاحب رخصت ہوئے تو علی میاں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ بھائی وہ اس وقت ہمارے مہمان تھے۔ مگر ابوبکر صاحب نے جواب دیا کہ مہمان کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمارے دین کی توہین کرے۔

جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ گیا تھا اور یوں علی میاں سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ہاں ان کی خیر خبر عمو جان، باجی امی یا ابوالحسنات کے خطوط سے کبھی کبھی مل جاتی

تھی۔ پاکستان میں ان سے پہلی ملاقات اسلامی اقتصادی کانفرنس کے موقع پر ہوئی۔ یہ کانفرنس غالباً ۱۹۷۸ء میں منعقد ہوئی تھی۔ علی میاں کے ساتھ مولانا منظور نعمانی بھی آئے تھے۔ میں علی میاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور یوں مولانا منظور نعمانی سے بھی تجدید ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے موقع پر میں نے علی میاں سے اپنا تعارف کرایا۔ کیونکہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد مجھ میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ مولانا علی میاں بہت تپاک سے ملے۔ گلے سے لگایا اور حاضرین سے فرمایا کہ یہ میرے بھانجے ہیں، مدت کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ اتنی طویل مدت کے بعد کے تعارف کی ضرورت پڑی ہے اور پھر مولانا نے حاضرین سے یہ بھی فرمایا کہ آپ لوگوں نے میری تحریروں اور تقریروں میں یہ شعر سنا اور پڑھا ہو گا۔

چلی بھی جا جرس غنچہ کی صدا پر نسیم
کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا

مصحفی کا یہ شعر میں نے پہلی بار کشفی صاحب کے کسی مضمون میں پڑھا تھا۔ میں حیرت زدہ ہو گیا، اللہ اکبر اتنے بڑے آدمی نے اتنی چھوٹی سی بات کو یاد رکھا اور اس کے ذکر کو مناسب جانا۔ رشید احمد صدیقی کی یہ بات یاد آئی کہ بڑا آدمی معمولی بات کو بھی بادنیٰ بہانہ غیر معمولی بنا دیتا ہے۔

یاد آیا کہ اس طویل مدت میں علی میاں سے ۱۹۶۳ء میں ان کے ایک خط کے ذریعے رابطہ قائم ہوا تھا۔ طاہرہ مرحومہ اور میرے بچوں کی وفات پر ہندوستان سے جو خط ملے ان میں علی میاں کا خط بھی شامل تھا۔ افسوس کہ وہ خط میرے پاس محفوظ نہ رہ سکا۔ اس میں علی میاں نے یہ فرمایا تھا کہ اللہ ایسی آزمائشوں کے ذریعے مسلمان کو اپنی ذاتِ عالیہ سے قریب تر کرتا ہے۔ اور اسے صبر کے مفہوم سے آشنا کرتا ہے۔ ایسے حادثات مقام صبر بھی ہیں اور مقام شکر بھی۔ یوں علی میاں نے مجھے صبر و شکر کے باہمی رشتے سے آگاہ کیا اور وہ بھی مجھ پر گزرنے والے ایک تجربے کی وجہ سے۔

علی میاں اعزہ کی دل داری کے ساتھ ساتھ خاندانی تعلقات کا بھی بہت پاس کرتے تھے۔ سید محمد جمیل صاحب سے ان کے برادرانہ تعلقات کی اساس یہی خاندانی روابط تھے۔ دو تین مرتبہ علی میاں گرمیوں میں کراچی آئے۔ گرمیاں جو اپنے ساتھ آم کا تحفہ لے کر آتی ہیں۔ ہوتا یہ کہ کسی دن فجر کی نماز ہم لوگ بنوری ٹاؤن کی جامع مسجد میں ادا کرتے، علی میاں کے مختصر خطاب کے بعد وہ لوگ جنہیں سید جمیل صاحب مدعو کر لیتے تھے گاڑیوں میں جمیل صاحب کے مکان پر جاتے۔ وہاں ہلکا سا ناشتہ کیا جاتا اور پھر بے تکلفی کے ساتھ آم کھائے جاتے۔ ان محفلوں میں اپنے ساتھیوں میں سے

مجھے ڈاکٹر سید ارتفاق علی کی شمولیت خوب یاد ہے۔ ارتفاق صاحب کے والد مولانا اسحاق الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے۔ اور ان سے علی میاں کی یاد اللہ تھی۔ ان محفلوں میں گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور علی میاں دینی نکات کو گفتگو کا حصہ اس طرح بناتے کہ ان کی دعوت الی اللہ زندگی کے مسائل و معاملات سے ہم آہنگ ہو جاتی اور اس میں کسی تکلف کا شائبہ تک محسوس نہ ہوتا۔ علی میاں کی تقریروں کا بھی یہی انداز تھا۔ موقع کی مناسبت سے وہ کسی قرآنی آیت سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے اور بات اسی آیت کے گرد اپنے دائرے بناتی رہتی۔ ایک سال انہوں نے کراچی میں بہت اجتماعات میں شرکت کی، اور اس دورے کی تقریریں حدیث پاکستان کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ بعض تقریروں میں پاکستان کے ساتھ جس محبت اور انسیت کا اظہار کیا گیا ہے اس کے پیش نظر اندیشہ ہوتا تھا کہ واپسی پر علی میاں کو ہندوستانی حکومت کے عتاب کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ لیکن وہ حق بات اور ایک مسلمان مملکت سے اپنی محبت پر مصلحت کا پردہ ڈالنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوئے۔

صدر پاکستان محمد ضیا الحق مرحوم کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ لیکن ان ملاقاتوں میں علی میاں نے ہمیشہ انہیں اہم نصیحتیں کیں اور کبھی کسی ذاتی ضرورت یا غرض کے حصول کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ مولانا علی میاں اور مولانا رشید نعمانی مرحوم صدر کی اسلام دوستی کے بہت قائل تھے۔ اور میں گستاخی کی حد تک ان بزرگوں کی رائے سے اختلاف کرتا تھا۔ ایک دن میں نے علی میاں یا مولانا نعمانی (دونوں اس محفل میں موجود تھے) سے بڑی سادگی سے پوچھا کہ اپنے دعوے کو پورا نہ کرنے والے کو کس حد تک اچھا مسلمان کہا جا سکتا ہے؟ اور اس حکم **یأیھا الذین امنوا اوفوا بالعقود** (القرآن) کی حدود کہاں تک جاتی ہیں؟ جس آدمی کی نوے دن کی مدت پھیل کر کئی سال پر محیط ہو جائے تو اسلام کی خدمت کے بارے میں اس دعوے کو کہاں تک تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ اس پر ان بزرگوں نے جس انداز سے بات کی اس سے ضیاء الحق پر میرے اعتراضات کی شدت میں خاصی کمی آگئی، انہوں نے کہا کہ عہد رسالت سے قربت بہت بڑی برکت ہے، اسی لیے ہمیں جو برکات و فیوض حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کے دور میں نظر آتے ہیں وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں کم ہو گئے۔ ضیاء الحق صدیوں کے فاصلے پر کھڑے ہیں۔ اور پھر بھی ان میں خدمت اسلام کی رمق ہے، دعا کیجئے کہ اس میں اضافہ ہو۔

میں کہہ یہ رہا تھا کہ علی میاں خاندانی روابط کا بہت خیال رکھتے تھے۔ علامہ خلیل عرب ان کے استاد تھے، علی میاں ان کی صاحبزادی عطیہ خلیل کا بہت احترام کرتے تھے، حالانکہ وہ عمر میں ان سے کہیں چھوٹی تھیں۔ عطیہ کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں پڑھاتی تھیں، ان کی دعوت پر علی میاں

نے شعبۂ عربی میں تقریر کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔ اور یہ تقریر بنیادی طور پر ان کے استاد کے متعلق تھی۔ علی میاں نے جب رابطہ ادب اسلامی کی بنیاد ڈالی تو انہوں نے از راہِ ذرہ نوازی مجھے اس تحریک میں شامل کیا۔ جب رابطہ ادب اسلامی کا اجلاس ترکی میں منعقد ہوا تو مجھے اس میں شرکت کی دعوت ملی مگر میں بوجوہ نہ جا سکا اور جب رابطہ ادب رسالے کاروانِ ادب کا اجرا ہوا تو مجھے اس کے مشیروں میں شمولیت کا اعزاز بخشا گیا۔ میں عملی طور پر اس رسالے کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ انتہا تو یہ ہے کہ خط کتابت میں بھی بڑی کاہلی کا ثبوت دیا۔ رابطہ ادب اسلامی کے ہندوستان میں کئی مذاکرے اور اجلاس ہوئے۔ ان میں مجھے شرکت کی دعوت ملتی رہی۔ اور اس کے مذاکرۂ بھوپال کے لئے میں نے ایک مضمون مولانا عبد الرشید نعمانی کے ذریعے بھیجا۔ اسلامی ادیبوں سے چند باتیں۔ یہ مضمون اول اول کاروانِ ادب میں ہی شائع ہوا۔

کراچی میں علی میاں سے بیعت ہونے کا سبب اور پس منظر میں حضرت مولانا سید زوار حسین شاہ صاحب کے خاکے میں کر چکا ہوں۔ علی میاں سے بیعت ہونے کے بعد جب میں نے اپنی بیوی سے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگیں کہ آپ مجھے بھی بیعت کرا دیتے تو اچھا ہوتا۔ میں نے انہیں چڑانے کے لئے کہا کہ علی میاں عورتوں کو بیعت نہیں کرتے، بات آئی گئی ہو گئی، کئی مہینوں کے بعد ایک صبح انہوں نے مجھ سے کہا کہ رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ ایک بڑا سا مکان ہے۔ کئی محرابوں والا مکان۔ سفید رنگ کا، اس مکان کے ایک برآمدے میں کھڑی ہوئی ہوں، اتنے میں مولانا علی میاں آ جاتے ہیں۔ میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ نے مجھے بیعت کرنے سے انکار کیوں کیا؟ میں تو آپ کی بہو ہوتی ہوں۔ وہ مسکراتے ہیں، کہتے ہیں اپنا ہاتھ بڑھاؤ، پھر انہوں نے اپنی جیب سے قلم نکالا، اور میری ہتھیلی پر انہوں نے قرآن حکیم کی کوئی آیت لکھدی ، پھر میری آنکھ کھل گئی۔ ان دنوں ہم ہر سال ہندوستان جایا کرتے تھے۔ لیکن ویزا چند ہی شہروں کا ملتا۔ میں لکھنؤ کا ویزا ہمیشہ لیتا کہ علی میاں سے ملاقات ہو سکے۔ لیکن ہوتا یوں کہ یا وہ ملک سے باہر ہوتے یا کسی تبلیغی دورے پر اور یوں کئی سال ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ ایک سال میں نے پہلے ہی خط لکھ کر اپنی آمد سے انہیں مطلع کر دیا تھا اور انہوں نے جواباً لکھا کہ وہ لکھنؤ میں میرا انتظار کریں گے۔ میں جب اس سال ہندوستان گیا تو ندوے فون کر کے معلوم کر لیا کہ علی میاں کس تاریخ کو لکھنؤ آئیں گے۔ مقررہ تاریخ کو میں اور ابو الحسنات تصنیف سلمہ، کی گاڑی میں لکھنؤ پہنچے، سردی سخت تھی۔ لکھنؤ پہنچ کر معلوم ہوا کہ موسم کی خرابی اور دھند کی وجہ سے علی میاں نہیں آ سکے۔ ہم کان پور لوٹ گئے۔ نہ جانے کس وجہ سے میں بلقیس کو اپنی ساتھ نہ لے جا سکا تھا۔ ہمارے ناکام لوٹنے پر انہوں نے کہا کہ جب تک سید کی